جمیل مہدی

۱۹۶۰ء کے آخری مہینوں کی ٹھنڈی راتوں میں سے کوئی رات تھی جب عشاء کے قریب والد ماجد کا ٹیلی فون آیا کہ تمہارے پاس بھائی جمیل مہدی اوران کے ایک عزیز آرہے ہیں، قیام تمہارے پاس ہی کریں گے۔فون رکھنے کے چند منٹ کے بعد ایک صاحب شیروانی پہنے اور دوسرے سوٹ زیب تن کئے ہوئے مع سامان کے آگئے۔ پریس کے دفتر میں داخل ہوتے ہی سلام کی آواز آئی اور یہ کہ میں جمیل ہوں۔ میرے ساتھ یہ میرے عزیز اسامہ بن فاضل ہیں ان کے کام سے ہی لکھنؤ آنا ہوا۔تمہارے ابا جی سے دیوبند میں بار بار ملاقات ہوتی ہے اسی کی بنیاد پر میں وہاں گیا تھا کہ قیام مولانا کے پاس کروں گا،مولانا نے فرمایا کہ تمہارے قیام کے لئے حفیظ کا گھر زیادہ مناسب ہے اور میں چلا آیا۔

صبح ناشتہ پر تفصیل سے بات ہوئی معلوم ہوا کہ اسامہ صاحب کسی میونسپل بورڈ میں ایگزیکیٹیو افسر ہیں جو تیسرے درجہ کا ہے لیکن ان کی جیسی ہی علمی صلاحیت اور ڈگری والے تین افسروں کو دوسرے درجہ کی میونسپلٹی میں ترقی دے کر بھیجا گیا ہے،ہم بھی حقدار ہیں اس لئے ہمیں بھی کسی دوسرے درجہ کی میونسپلٹی میں بھیج دیا جائے۔جمیل بھائی نے مجھے جو کچھ بتایا اس میں وہ مجھ سے کوئی مدد نہیں

چاہتے تھے، اس لئے کہ وہ دیو بند کے ایم ایل اے کے پاس آئے تھے۔ ناشتہ کے بعد رخصت ہو گئے اور کہہ گئے کہ رات کو صرف اسامہ کھانا کھائیں گے اور اسی وقت ملاقات ہو گی۔ شاید تین دن گذر گئے کہ وہ دونوں صبح چلے جاتے اور رات ڈھلے واپس ہوتے۔

ایک دن رات کو میں نے معلوم کر لیا کہ آسان سے کام میں اتنا وقت کیوں لگ رہا ہے؟ جب کہ نظیر سامنے ہے۔ جمیل بھائی نے بتایا کہ جن کو ترقی دی گئی ہے وہ ہندو ہیں اور اسامہ بن فاضل مسلمان ہیں میرے نزدیک اصل رکاوٹ یہ ہے، ورنہ یہ ایک دن کا بھی نہیں ایک گھنٹہ کا کام تھا اور بغیر لکھنؤ آئے ہوئے بھی ہو سکتا تھا، دوران گفتگو جمیل بھائی کے منہ سے نکلا کہ متعلقہ وزیر ریاست بھی مسلمان ہیں پھر انہوں نے نام بتایا تو ہماری زبان سے نکل گیا کہ ان سے تو ہمارا بہت اچھا تعلق ہے اور یہ طے ہوا کہ کل ہم بھی ساتھ چلیں گے۔

دوسرے دن ہم تینوں گئے بہت تپاک سے ملے ہم نے معاملہ پر بات کی تو کہا کہ میں برابر فائل منگوا رہا ہوں سکریٹری دبائے بیٹھا ہے۔ ہم نے حیرت سے کہا کہ آپ منسٹر ہیں اور وہ سکریٹری پھر یہ کیا کہ آپ فائل منگوائیں اور وہ نہ بھیجے! اور اسی دن یہ فیصلہ ہو گیا کہ آج جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ منسٹر صاحب نے براہ راست ٹیلی فون کیا کہ اسامہ بن فاضل کی فائل لے کر آپ خود میرے پاس آیئے۔ ہم لوگ وہاں سے ہٹ گئے۔ پھر معلوم ہوا کہ دو بجے سکریٹری صاحب آئے تھے فائل بھی لائے تھے اور بات کر کے چلے گئے۔ شام کو ہم تینوں پھر منسٹر صاحب کے کمرہ میں آئے تو انہوں نے بمشکل اتنا کہا کہ سکریٹری صاحب نے بتایا کہ وہ تین بتا دے تو پولیٹیکل پریشر کی وجہ سے کرنا پڑے۔ ان کے ان جملوں سے واضح ہو گیا کہ اسامہ کو ترقی نہیں ملے گی۔ اس لئے کہ منسٹر بھی مسلمان ہیں سکریٹری بھی اتفاق سے مسلمان اور فریادی بھی مسلمان ہے اس ذہنیت کو ننگا دیکھنے کے بعد دونوں مہمان ناکام واپس ہونے لگے

تورسمی باتیں بھی ہوئیں اور دونوں نے محسوس کیا کہ ان ملاقاتوں کے نتیجہ میں ہم لوگ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔

مارچ ۱۹۶۲ء میں جب ندائے ملت نکالنے کا فیصلہ کیا گیا تو قلمی معاونین کی جو فہرست بنی ان میں دیوبند سے ایک نام جمیل مہدی کا بھی تھا دوسرا نام مولانا حامد الانصاری غازی کا تھا لیکن ان سے کچھ لکھوا کر بھیجنا جمیل بھائی کی ذمہ داری تھی۔ اخبار نکلتا رہا جمیل بھائی کا مضمون مہینہ میں کم از کم ایک آ جاتا تھا۔ غازی صاحب کا ایک طویل مضمون تو آیا پھر انہوں نے کچھ نہیں لکھا۔ ۱۹۶۴ء میں جب آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کی تشکیل ہوئی اور یوپی کا صدر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی صاحب کو بنایا گیا تو انہوں نے مشاورت کے ترجمان کے طور پر ''قائد'' نکالنے کا فیصلہ کیا، اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لکھنؤ سے اردو میں صرف قومی آواز نکل رہا تھا۔ دوسرا اخبار جو لکھنؤ میں کافی پڑھا جاتا تھا وہ ''سیاست'' تھا اور دونوں مشاورت کے مخالف تھے۔

ڈاکٹر صاحب نے بہت دھوم دھام کے ساتھ ''قائد'' نکالا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اردو کے آدمی نہیں تھے اور نہ انہیں اس کی فرصت تھی کہ دیکھ کر رائے قائم کریں کہ جس مقصد سے اخبار نکالا تھا وہ پورا ہو رہا ہے یا نہیں؟ اخبار میں روح پھونکنا ایڈیٹر کا کام ہے۔ ''قائد'' جو دو انتہائی مقبول اخباروں کے دور میں نکلا تھا اس کے لئے کسی بہت منجھے ہوئے صحافی کی ضرورت تھی جو اس کی ادارت سنبھالے، ڈاکٹر صاحب نے صرف ایک صحافی پر اعتماد کیا اور انہوں نے اپنے کسی جونیئر کو بھیج دیا جس نے اخبار نکال تو دیا لیکن وہ اسے سنبھال نہ سکا اور انتہائی جوش وخروش سے نکلنے والا اخبار سمٹنے اور سکڑنے لگا۔

جمیل بھائی کے مضامین سب لوگ ندائے ملت میں بھی پڑھتے تھے اور ''بیباک'' سہارنپور میں بھی، لیکن ان کے نام کے ساتھ ان کے مزاج کی بھی شہرت تھی۔ پھر یہ فیصلہ ہوا کہ والد ماجد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ میں جائیں تو ان

سے بات کریں۔ بعد میں والد ماجد نے ہی خبر دی کہ بھائی جمیل کو انہوں نے آمادہ کرلیا ہے اور وہ چند روز کے بعد لکھنؤ آجائیں گے، حسب وعدہ جمیل بھائی آگئے۔ ایک رات میرے پاس قیام رہا، کہنے لگے کہ حضرت مولانا نے مجھے حکم دیا کہ آکر ''قائد'' سنبھال لو!...... میں نے معذرت چاہی تو مولانا نے فرمایا کہ تمہاری تحریروں سے ملت کو فائدہ ہوگا۔ میں نے کہا بھی کہ حضرت جو ملت کلام پاک سے فائدہ نہ اٹھاسکی وہ میری تحریروں سے کیا اٹھائے گی لیکن حکم میں نرمی نہیں آئی اور میں چلا آیا۔

دوسرے دن جمیل بھائی مع سامان کے فریدی بلڈنگ چلے گئے۔ جمیل بھائی سے پہلے ''قائد'' کے ایڈیٹر عارف صاحب تھے جو بھوپال کے رہنے والے تھے۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ جمیل صاحب آرہے ہیں، اس لئے وہ ایک دن پہلے ہی بھوپال چلے گئے اور جمیل بھائی کو قدم رکھتے ہی قلم سنبھالنا پڑ گیا۔ ''قائد'' چار صفحات کا اخبار تھا یو این آئی سروس کے بعد اخباروں میں زیادہ کام نہیں ہوتا تھا پھر بھی دو معاون ان کی مدد کرنے کے لئے تھے۔ جمیل بھائی نے کوشش کی کہ پہلے دن ہی معلوم ہوجائے کہ اب اخبار وہ نہیں ہے جواب تک نکلتا رہا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر دن اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ جمیل بھائی کو صبح کوئی کام نہیں ہوتا تھا ڈاکٹر صاحب بھی بے حد مصروف ہوتے تھے اس لئے وہ اکثر میرے پاس چلے آتے تھے اور دو بجے کے بعد واپس جاتے تھے۔

جمیل بھائی جتنی دیر میرے پاس رہتے تھے اس وقت اکثر بھائی صاحب بھی ہوتے تھے اور موضوع گفتگو مسلم مجلس مشاورت ہی ہوتا تھا یا ندائے ملت اور قائد۔ ایک دن اچانک انہوں نے کہہ دیا کہ ندائے ملت کو جو تم اپنا اپنا کہتے رہتے ہو یہ تمہارا کہاں سے ہوگیا؟ ہم نے اپنے نزدیک جو جواب دیا اس کے بعد انہیں خاموش ہوجانا چاہئے تھا لیکن وہ اپنی بات پر اڑے رہے کہ اس اخبار کا مالک ٹرسٹ ہے، ٹرسٹ میں اگر کوئی اختلاف ہوگیا تو تمہاری حمایت

کرنے والا تمہارے ابا جی کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ ہم نے ٹوک کر کچھ اور کہنا چاہا تو جمیل بھائی نے روک دیا اور کہا کہ حضرت مولانا علی میاں، ڈاکٹر اشتیاق صاحب، شفیق الرحمٰن صاحب، سید اصغر حسین صاحب اور ظفر احمد ایڈوکیٹ ان میں سے ایک بھی وہ نہیں ہے جو تمہاری طرفداری کرے بلکہ سب وہ ہیں جو صحیح ہو یا غلط ڈاکٹر فریدی صاحب کی حمایت کریں گے۔

ہم جمیل بھائی سے وہ کہلوانا چاہتے تھے جو انہوں نے سنا، یا دیکھا، لیکن وہ منجھے ہوئے صحافی تھے وہ بس یہی کہتے رہے کہ تم پرنٹر پبلشر اس لئے ہو کہ ٹرسٹ نے بنایا ہے۔ لیکن تم نے اخبار کے لئے جو جو قربانیاں دیں یا اسے مقبول بنانے کے لئے ہر خطرہ تم نے مول لیا وہ تمہارا اپنا شوق تھا ٹرسٹ کی ہدایت نہیں تھی۔

اس دن ہم نے سمجھ لیا کہ فریدی بلڈنگ میں ہونے والی منصوبہ بندی پوری طرح جمیل بھائی کے علم میں ہے لیکن بڑائی اسی میں ہے کہ وہ اشاروں سے آگے نہ بڑھیں۔ اس کے کافی دنوں کے بعد وہ واقعہ پیش آیا کہ ڈاکٹر آصف قدوائی نے مسلم مجلس کے قیام کے فیصلہ کو غلط لکھ دیا ڈاکٹر صاحب کے ادارتی نوٹ سے بھونچال آگیا اور اونچے لہجے میں یہ باتیں ہونے لگیں کہ ندائے ملت کو فریدی بلڈنگ میں لے آیا جائے اور اسے قائد سے منسلک کر دیا جائے۔ چند روز کے بعد والد ماجد نے بتایا کہ پرسوں ٹرسٹ کی میٹنگ بلائی ہے اور یہ بھی ذکر آیا کہ ضرورت کیوں پیش آئی، میں نے کہہ دیا ہے کہ میں اس میں شریک نہیں ہوں گا اور نہ مجھے بلایا جائے۔

ہم نے محسوس کر لیا کہ جمیل بھائی جو بار بار کہتے تھے وہ اب سامنے آنے والا ہے۔ اس وقت میرے دوستوں میں اتفاق سے وکیلوں کی ایک فوج تھی بات ان کے سامنے آئی تو انہوں نے معلوم کیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟ ہم نے بتایا کہ اخبار کا مالک بیشک ٹرسٹ ہے لیکن ہم اس طرح دست بردار نہیں ہونا چاہتے جیسے ملازم ہوں کہ اب ہماری خدمات کی ضرورت نہیں۔ ہمارے دوستوں نے ہمیں کچھ

مشورے دیئے کچھ کاغذی تیاریاں کرائیں اور عدالت سے ٹرسٹ کی میٹنگ کو اسٹے کرادیا۔ عدالت کا پیروکار اور ایک دوست اس وقت اسٹے آرڈر لے کر پہنچے جس وقت میٹنگ ہو رہی تھی۔ آرڈر کو دیکھتے ہی سب خاموش ہو گئے اور جوتے اٹھا کر اپنے اپنے دولت خانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

جمیل بھائی دیوبند میں کچھ دن رہ کر لکھنؤ واپس آچکے تھے اور دور دور سے شریک بھی تھے۔ ہمارے لئے سب سے زیادہ حیران کرنے والا ٹرسٹ کے چیرمین اور والد ماجد کے بعد ہمارے سب کچھ حضرت مولانا علی میاں کا برتاؤ تھا۔ شاید ایک واقعہ کو بھلا کر ہم نے غلطی کی تھی وہ یہ تھا کہ حضرت مولانا کے برادر زادے دفتر آئے ندائے ملت کا پانچواں پرچہ تیار ہو رہا تھا، بھائی صاحب بار ادارت اٹھائے ہوئے تھے انہوں نے بھائی صاحب کو ایک مضمون دیا اس سے پہلے وہ درس قرآن طرز کے دو مضمون دے چکے تھے۔ بھائی صاحب نے رکھ لیا۔ کہا گیا کہ اسے دیکھ لیجئے، بھائی صاحب نے کھولا تو عنوان تھا "۵ کروڑ مسلمان" بھائی صاحب نے کہا کہ یہ موضوع تو اپنے چچا جان کے لئے چھوڑ دیجئے۔ جواب ملا کہ یہ ہم نے خون جگر سے لکھا ہے اس جملہ کے بعد بھائی صاحب نے اسے خاموشی کے ساتھ رکھ لیا۔

اسی دن یا دوسرے دن بھائی صاحب نے حضرت مولانا کی خدمت میں وہ مضمون پیش کیا اور ان سے درخواست کی کہ.......... کو سمجھا کر اسے واپس کر دیجئے، یہ ندائے ملت کے معیار کا نہیں ہے، لیکن اگر آپ کا حکم ہوگا تو ہر حال میں چھپے گا۔ پھر اس مضمون کا ذکر ختم ہو گیا ان سے قرآن پر لکھنے کی فرمائش بھی کی تو انہوں نے مصروفیت کا عذر کر دیا۔ ندائے ملت ماشاء اللہ کمان سے نکلے تیر کی طرح اوپر اور اوپر جاتا رہا اور چند مہینے میں ہی وہ واقعی ملت کی آواز بن گیا۔

شاید چار پانچ ماہ کے بعد دارالعلوم ندوہ میں تبلیغی اجتماع تھا اور بڑا اجتماع تھا ہم پہلے ہی دن دوپہر کے بعد پہنچے تو ایک بہت خوبصورت اخبار تقسیم ہوتے ہوئے دیکھا تقسیم کرنے والوں کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ بھی نظر آئی،

ہم سامنے آئے تو بڑے خلوص سے ہمیں بھی نوازا گیا۔ٹائٹل پر ایک حکایت چھپی تھی کہ کوئی بڑے صوفی بزرگ کسی ایسی بستی میں جا پہنچے جہاں پہلے سے ہی ایک بہت بڑے بزرگ جلوہ افروز تھے انہیں کسی بزرگ کے آنے کی خبر ملی تو انہوں نے دودھ کا ایک لبریز پیالہ خدمت عالی میں بھیجا۔یعنی یہاں تو پہلے ہی سے دینی خدمت کا فریضہ ادا ہو رہا ہے۔باہر سے تشریف لانے والے بزرگ نے دودھ کے اس پیالہ پر گلاب کی ایک پتی رکھ کر واپس کر دیا۔گویا ابھی ایک پتی بھر کی جگہ باقی ہے۔ایک منٹ میں ہی سمجھ میں آ گیا کہ یہ کہانی ندائے ملت اور تعمیر حیات کی ہے۔پھر کھولا تو اداریہ کے صفحہ پر جو مضمون چھپا تھا اس کا عنوان تھا ''۵ کروڑ مسلمان'' تب کہانی پوری ہوگئی کہ گلاب کی پتی وہ مضمون تھا۔

حضرت مولانا علی میاں مدظلہ سے تو بھائی صاحب نے عرض کر دیا تھا کہ اگر آپ حکم دیں تو یہ اسی اشاعت میں چھپے گا لیکن یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ اتنی عظیم شخصیت اپنے ایک اولاد جیسے چھوٹے کی دل جوئی اور ان کی بچکانہ خواہش کی تکمیل کے لئے مضمون ہی چھاپنے کا حکم نہیں بلکہ ندائے ملت سائز کے اتنے ہی صفحات کے اور اسی سے ملتے جلتے مضامین پر مستقل باقاعدہ ایک اخبار جاری کرا دے گی۔

یہ واقعہ ۱۹۶۲ء کا ہے اور ہمارے دست بردار ہونے کا واقعہ ۱۹۶۷ء کا ہے یعنی پانچ سال تک سب نے دیکھا کہ ہم نے ندائے ملت کے لئے کیا کیا اور کس حد تک کیا؟ جسے اس کی تفصیل دیکھنا ہو وہ میری جیل کی کہانی ''روداد قفس'' پڑھ لے اس میں ہر بات آ گئی ہے۔اور ہمارے اوپر جو کچھ بیتی وہ سب کے سامنے تھا اس کے باوجود ٹرسٹ کی میٹنگ کے ذریعہ اخبار کے مستقبل کے فیصلہ پر گفتگو کرنے کے لئے سب کا تیار ہو جانا اور حضرت مولانا کا یہ نہ فرمانا کہ ندائے ملت کے مسئلہ پر آصف قدوائی اور حفیظ کو الگ کر کے سوچا بھی کیسے جا سکتا ہے؟ بلکہ اس میٹنگ کی صدارت کرنا جس میں ندائے ملت کے بانی والد ماجد نے

شریک ہونے سے انکار کردیا تھا۔ ہر بات ہمارے لئے حیرت کی تھی لیکن ایک شبہ ہوتا تھا کہ شاید اس رویہ کے پیچھے خون جگر سے لکھا ہوا وہ مضمون ہے، جس کا عنوان تھا ''۵ کروڑ مسلمان'' اور اس کے علاوہ تو کوئی بات نہیں تھی۔

ٹرسٹ کی وہ میٹنگ نہیں ہوئی ہم جو چاہتے تھے کہ اخبار ہم سے لیا نہ جائے بلکہ ہم خود اسے ان کو دیدیں وہ بھی ہو گیا اور ہم نے کچہری جا کر ڈکلریشن سے اپنا نام واپس لے لیا اور دفتر کا جو سامان تھا وہ سب ایک ملازم کے ذریعہ ڈاکٹر قریشی صاحب کے پاس بھجوا دیا۔

ان تمام واقعات کے کافی دنوں کے بعد حضرت مولانا علی میاں کی خود نوشت سوانح ''کاروان زندگی'' کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ ہم نے اس کی زیارت کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس کے صفحہ ۴۸۵-۴۸۴ پر ایک ذیلی عنوان ہے ''ہفتہ وار ندائے ملت کا اجراء'' نیچے چھپا ہے کہ

> ''۶۱-۶۰ء میں شدت سے یہ بات محسوس ہونے لگی تھی کہ صحافت اور سیاست دونوں میدانوں میں ایسی جرأت مندانہ قیادت اور رہنمائی کی کمی ہے جو مسلمانوں کے مسائل اور حالات حاضرہ سے گہری واقفیت، دیانتدارانہ تجزیہ اور بے لاگ مشورے پر مبنی ہو، اور اسی کے ساتھ اس پر دینی فکر کا رنگ غالب ہو، اس احساس نے مولانا محمد منظور صاحب نعمانی اور مجھ کو مجبور کیا کہ وسائل کی قلت اور خالص دینی مزاج ہونے کے باوجود اس میدان میں کچھ اقدام کریں۔ خوش قسمتی سے ہم کو ڈاکٹر محمد آصف قدوائی جیسا بالغ نظر سیاست داں اور پختہ کار اہل قلم بھی مل گیا، جو اکثر اس کے اداریے لکھتے تھے اور ہم نے خدا کے بھروسہ پر ۱۲؍مارچ ۱۹۶۲ء کو ندائے ملت کا پہلا پرچہ شائع کیا جس نے بہت جلد مسلمانوں کے سنجیدہ اور صاحب فکر حلقہ میں مقبولیت حاصل کرلی۔ ''ندائے ملت'' نے مسلم اخبارات

ورسائل میں اپنا ایک مقام پیدا کرلیا اور ایسا نظر آنے لگا کہ ایک
نئی دینی فکری قیادت ابھر رہی ہے، لیکن مسلمانوں کے بہت سے
کاموں کی طرح ۷-۶ سال تک کامیابی کے ساتھ نکلنے کے بعد
اس کو بھی نظر لگ گئی اور اس کے مختصر سے عملہ میں بھی انتشار پیدا
ہوگیا۔ اور ۶۸ء کے اخیر یا ۶۹ء کے شروع میں اس کے انتظامیہ
میں کچھ تبدیلی کرنی پڑی۔''

کاروان زندگی چھپی تو بھائی صاحب لندن جا چکے تھے انہوں نے اسے
وہیں دیکھا اور ادب واحترام کے لئے استعمال ہونے والے تمام الفاظ اور
اصطلاحات قدموں پر رکھتے ہوئے ایک خط میں عرض کیا کہ انہیں ان صفحات کو پڑھ
کر اس لئے تکلیف نہیں ہوئی کہ انہوں نے ندائے ملت کے لئے اپنے کو اتنا نچوڑ دیا
کہ ملک بدری کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں بچا تھا، اس کے باوجود اس تحریر میں ان کا
ذکر تک نہیں ہے بلکہ اس کی تکلیف ہے کہ ''ندائے ملت'' جس حفیظ کی تجویز تھی، جس
نے ٹیم بنائی، جس نے ملک کی تاریخ موڑنے کے لئے مسلم یونیورسٹی نمبر نکالنے میں
بے مثال بہادری اور ذہانت کا ثبوت دیا اور جس نے ندائے ملت کا علم بلند رکھنے کے
لئے نو مہینے جیل میں گذار دیے اس کا نام تک کتاب میں نہیں ہے۔

بھائی صاحب ہی سے معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے مفکر اسلام اور مینار علم
ودعوت حضرت مولانا کی خدمت میں عریضہ بھیجا تھا۔ جس کے جواب میں کوتاہی
پر افسوس کے ساتھ یہ خوشخبری بھی دی گئی تھی کہ دوسرے ایڈیشن میں مضمون تبدیل
کردیا جائے گا۔

اس وقت میرے سامنے دوسرا ہی ایڈیشن ہے اور اس میں نہ کوئی لفظ کم
ہے نہ زیادہ، مجھے یہ کڑوا گھونٹ اس لئے پینا پڑ رہا ہے کہ ندائے ملت کے ابتدائی
چھ سال کی فائلیں۔ میری کتاب ''روداد قفس'' اور جمیل بھائی کے تعاون سے نکلنے
والے ''عزائم'' میں چھپے ہوئے مضامین پڑھنے والے اس آزمائش میں پڑ جائیں
گے کہ حضرت سے تو کتمانِ حق ممکن ہی نہیں ہے۔ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی جمیل

مہدی اور حفیظ نعمانی نے ہی جھوٹی کہانیاں اور طلسمی افسانے لکھ دیے ہیں۔ اللہ انہیں معاف فرمائے۔

حضرت مولانا نے ندائے ملت کے متعلق لکھنے کے بعد ایک حاشیہ تحریر فرمایا ہے جس میں لکھا ہے کہ اخبار اب بھی جاری ہے۔ ہمارے دوست ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اس کے مرتب و منتظم ہیں۔

ندائے ملت کو ڈاکٹر قریشی صاحب کے سپرد کر کے ہم سب فارغ ہو گئے تھے، جمیل بھائی دیوبند نہیں جانا چاہتے تھے، سب کو یہ احساس تھا کہ جب تک ندائے ملت ہم لوگوں کے ہاتھوں میں تھا تو ع ''زمانہ بڑے غور سے سن رہا تھا''۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ دوسرا اخبار نکالا جائے لیکن اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی۔ بنام خدا فیصلہ کر لیا، ''عزائم'' نام بھی مل گیا۔ تو سرمایہ فراہم کرنے کی مہم شروع ہوئی، پہلے لائف ممبر بنانا شروع کئے اسی سلسلہ میں مقبول لاری صاحب کے پاس بھی گئے تو انہوں نے کاروباری طریقہ سے بہت مدد کی، اسی زمانہ میں کسی کام سے یونس سلیم صاحب لکھنؤ آئے، وہ ہر بات سے واقف تھے انہیں پہلا پرچہ دیا، انہوں نے فوراً پانچ سو روپے نکال کر دئے، ایک بہت پیارے دوست کو جب لائف ممبر بنانا چاہا تو انہوں نے روپے تو نکال کر رکھ دئے مگر کہا کہ ہم کو نہیں ابا کو بناؤ تا کہ ان کے مرنے کے بعد ہم بن جائیں اور مشورہ دیا کہ ایسے کسی کو نہ بنانا جس کے باپ بوڑھے ہوں سب کے باپوں کو بنانا۔

''عزائم'' نکلا اور اس نے ''ندائے ملت'' جیسی تو نہیں لیکن بہت مقبولیت حاصل کر لی۔ لیکن ہم نے محسوس کیا کہ ہمارا ذاتی معاملہ بگڑ رہا ہے۔ عزائم کی طباعت ہم لیتے نہیں تھے، اخبار کی مصروفیات کی وجہ سے پریس سے غیر حاضر بھی رہنا پڑتا تھا، پھر بھی شاید دو برس یا اس سے زیادہ یہ بوجھ اٹھایا۔ اس کے بعد ہم نے ایک دن جمیل بھائی سے کہا کہ اب بوجھ ناقابل برداشت ہو گیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ قوم سے معافی مانگ کر ''عزائم'' کو بند کر دیں۔ جمیل بھائی نے سکون سے سنا اور کہا کہ ایک مہینہ کا وقت دو پھر فیصلہ کریں گے۔

تقریباً دو ہفتہ کے بعد انہوں نے کہا کہ اگر اخبار نکلتا رہے اور پرنٹر پبلیشر نیز پارٹنر بدل جائے تو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟ میں نے فوراً کہا کہ اگر ''عزائم'' زندہ رہے اور اس میں کہیں بھی میرا نام نہ ہو تو میں دل سے تیار ہوں اور دو مہینے تک چھپائی کی اجرت بھی نہیں لوں گا۔

انہوں نے بتایا کہ فلاں دوست جو تمہارے بھی دوست ہیں اس کے لئے تیار ہیں، ہم نے چند دن میں قانونی کارروائی کر کے اخبار کا بوجھ اتار دیا۔

اخبار کا بوجھ اتارنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہم نے عزائم سے تعلق ختم کر لیا بلکہ صرف مالی بوجھ تھا۔ رہا اس کی تیاری یا اس کے لئے کچھ لکھنا یا اسے ترتیب دینا، اس میں کوئی فرق اس لئے نہیں آیا کہ نہ ہم نے کبھی اپنے کو عزائم سے الگ سمجھا اور نہ جمیل بھائی کے دماغ میں ایسی کوئی بات آئی۔ یہی سبب تھا کہ انہیں جب بھی دیوبند جانا ہوا وہ اخبار کو پوری طرح میرے اوپر چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور میں ڈاکٹر آصف قدوائی صاحب کی قلمی اعانت سے عزائم کو تیار کر کے روانہ کرا دیتا تھا۔

جمیل بھائی میرے ساتھ جیسے رہتے کھاتے اور پیتے تھے اس میں بھی کوئی فرق میں نے نہیں آنے دیا۔ میرا ان کا تعلق دوستوں سے بڑھ کر بھائیوں جیسا تھا۔ کم از کم تین بار ایسا ہوا کہ میں نے عزائم کے لئے کسی موضوع پر لکھنا چاہا اور میں دوسری مصروفیات کی وجہ سے نہ لکھ سکا یا پٹری سے اتر گیا تو وہ میں نے جمیل بھائی کو دے دیا کہ میری موٹر سائیکل سڑک سے اتر کر کھیت میں آگئی۔ اگر یہ بن سکے تو بنا دیجئے ورنہ پھاڑ دیجئے، اور میں جب دوسرے دن ناشتہ لے کر اوپر سے آیا تو دیکھا کہ وہ میرے مضمون کو لئے بیٹھے ہیں۔ میں نے معلوم کر لیا کہ کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگے چماری کو کپڑے پہنا رہا ہوں، میرے ساتھ ان کا رویہ برسوں ایسا ہی رہا۔ میرے حلقہ کے علاوہ اگر کسی سے ان کی ملاقات ہوگئی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر لاتے تھے اور معلوم کرتے تھے، دیکھو یہ تمہارا دوست تو نہیں ہے۔ ایسی

نہ جانے کتنی ادائیں ان کے اندر تھیں جن سے رات کو محفل گرم رہتی تھی۔

انہی دنوں میں ان کے چھوٹے اور اکلوتے بھائی عقیل مہدی کا انتقال ہوگیا۔اس خبر کا آنا تھا کہ جیسے ان کے اوپر بجلی گر گئی، فوراً ہی تیار ہوئے اور شام کو دیوبند کے لئے روانہ ہوگئے۔ان کے جانے کے بعد میں نے ڈاکٹر آصف قدوائی صاحب کو خبر سنائی اور کہا کہ میں اکیلا ہوں۔ڈاکٹر صاحب نے فرمایا پرسوں منگوالینا ۔یہاں ایک بات اور کہتا چلوں کہ ''عزائم'' کی مجلس ادارت میں ایک سال تک چار نام رہے ڈاکٹر آصف قدوائی، جمیل مہدی، حفیظ نعمانی اور محسن عثمانی۔لیکن ڈاکٹر آصف صاحب سے ہم لوگ بہت کم لکھواتے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ جب ندائے ملت ہم لوگوں نے ٹرسٹ کے رکن ڈاکٹر اشتیاق صاحب کے حوالے کردیا تو وہ ڈاکٹر فریدی صاحب کو لے کر آئے اور آصف صاحب سے فرمائش کی کہ ندائے ملت میں جیسے آپ پہلے لکھتے تھے ایسے ہی لکھتے رہیں۔آصف بھائی نے معذرت کرلی اور یہ کہا کہ وہ ایک ٹیم تھی جس سے اخبار ایسا نکلتا تھا۔میری صحت اس قابل نہیں ہے کہ میں اخبار کا بوجھ اٹھاؤں بہر حال انہوں نے عذر کردیا۔

ڈاکٹر قریشی صاحب اور ڈاکٹر فریدی صاحب کی عزت کا سوال تھا وہ جمیل بھائی کے جانے کے بعد قائد کا حال دیکھ چکے تھے۔اب ندائے ملت کو برباد ہوتا دیکھنا آسان نہیں تھا، انہوں نے آصف بھائی کے پڑوسی ان کے محترم اور والد کے دوست شفیق الرحمٰن ایڈوکیٹ اور ان کے حقیقی ماموں سید اصغر حسین بارایٹ لا سے دباؤ ڈلوایا۔یہ دونوں حضرات بھی ٹرسٹ کے ممبر تھے (مگر بس نام کی حد تک) انہوں نے بھی ایک حد تک اصرار کیا۔آصف بھائی نے اپنے ماموں جان جن کا وہ اپنے والد کی طرح ادب کرتے تھے سے کہا کہ یہ جو اختلاف ہوا ہے وہ میرے ادارتی نوٹ کی وجہ سے ہوا ہے۔یہ نوٹ میں نے کسی کے کہنے سے نہیں اپنی طرف سے لکھا تھا کہ مسلم مجلس کا ایک سیاسی پارٹی کے طور پر قیام مسلمانوں کے حق میں نہیں ہے۔سارے اختلاف کی جڑ یہ ہے اور اسی وجہ سے سب کچھ ہوا ہے، اب میں کیسے ندائے ملت میں لکھ سکتا ہوں؟ اس کے بعد

انہوں نے حضرت مولانا علی میاں کو لاکر بٹھادیا، شاید یہ سوچ کر کہ ان سے انکار کرنا اپنی عاقبت برباد کرنا ہے۔ حضرت مولانا نے بھی وہی فرمائش کی اور آخری فرمائش یہ کی کہ اچھا صرف ایک ہی اداریہ لکھ دیجئے لیکن پروردگار آصف بھائی پر رحمت کی بارش کرے کہ انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ حضرت ایک اداریہ تو کیا میں ایک سطر بھی نہیں لکھ سکتا۔

ہم نے جب مجلس ادارت میں ڈاکٹر آصف قدوائی کا نام دیا تھا تو سب نے جا کر ان سے کہہ دیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ آپ کو یہ خیال نہ ہو کہ مجھ سے مشورہ کیوں نہیں کیا؟ اب آپ ہی فیصلہ کریں کہ آپ کا نام مجلس ادارت میں دیا جائے یا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ دیا جائے اور ضرور دیا جائے۔ ان کے اس فیصلہ کے بعد پہلا نام ان کا دیا گیا، جسے ایک سال کے بعد اس لئے ہٹا دیا کہ بابو ترلوکی سنگھ کے ہارنے کے بعد صورت حال بدل گئی تھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کبھی ہم لوگوں کی فرمائش پر کبھی اپنی خواہش پر کچھ لکھ دیا کرتے تھے اور وہی کہہ دیا کرتے تھے کہ ان کا نام دیا جائے یا نہیں۔ جمیل بھائی کے جانے کے بعد دو شمارے نکالے جس میں ڈاکٹر صاحب نے بہت مدد کی اس کے بعد جمیل بھائی آگئے مگر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے آدھے رہ گئے ہوں۔ انہوں نے اخبار تیار کیا اور اس میں ایک مضمون اپنے چھوٹے بھائی کی جدائی پر لکھا جس کا عنوان تھا ''ایک ہاتھ کا آدمی''۔ وہ مرثیہ بھی تھا نثری نوحہ بھی تھا اس میں ادب بھی تھا اور افسانہ کا انداز بھی۔ اس مضمون میں ان کی تمام صلاحیتیں دیکھی جا سکتی تھیں اسی لئے وہ عرصہ تک موضوع بنا رہا۔

''عزائم'' کی مالی ذمہ داری جن صاحب نے لی تھی انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کاروباری سلسلہ میں میرا لکھنؤ آنا ہوتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ میں رات کو رک کر باقی کام دوسرے دن کرتا ہوں۔ حفیظ کے دفتر میں اتنی جگہ نہیں ہے اور یہ کہ میں بوجھ بھی نہیں بننا چاہتا، اس لئے دفتر اور آپ کہیں اور منتقل ہو جائیں۔ اتفاق کی بات کہ چند روز کے اندر ہی ایک میٹنگ میں ہمارے

دوست سابق ڈپٹی اسپیکر اور بی کے ڈی کے جنرل سکریٹری رام نرائن ترپاٹھی ملے انہوں نے بتایا کہ ہلواسیہ کورٹ کے اوپر چار کمروں کا ایک فلیٹ الاٹ کرالیا ہے، جس کا کرایہ صرف اسی (۸۰) روپے ہے۔ ہم نے دریافت کیا کہ اس میں کیا فیملی کو رکھئے گا؟ کہنے لگے نہیں، کچھ لکھنے پڑھنے کے لئے ایک کمرہ کی ضرورت تھی۔ ہم نے بات اچک لی اور ان سے کہا کہ دو کمرے ہمیں دے دیجئے اور کرایہ پورا ہم دے دیا کریں گے۔

اس فیصلہ کے دو دن کے بعد ہی چابی مل گئی اور جمیل بھائی مع دفتر عزائم وہاں منتقل ہو گئے، ایک کمرہ کو دفتر بنایا دوسرے میں دو پلنگ، دو بستر اور آرام کا ضروری سامان لاکر سجا دیا گیا، اس کے بعد شام کو تنویر پریس کی طرح مجلس احباب وہاں جمنے لگی جہاں کبھی صرف جمیل بھائی ملتے کبھی دونوں دوست۔ زندگی اسی ڈگر پر چلتی رہی اخبار بھی نکلتا رہا اور صرف ہمارا آنا جانا ہی نہیں بلکہ ایسا بھی ہوتا رہا (جو کبھی کبھی ہو جاتا تھا) کہ پریس والے مکان کے نیچے والا نل کھلا رہ گیا اور اوپر پانی بہت کم آیا، تو میری چھوٹی بیٹی دھلنے والے ضروری کپڑے لے کر رکشے پر آ گئی اور اپنے جمیل تایا ابا کے باتھ روم سے کپڑے دھو کر لے گئی۔

دفتر عزائم اور جمیل بھائی کا ہلواسیہ میں ایک سال بھی شاید پورا نہیں ہوا تھا کہ ایک دن شام کو جمیل بھائی نے بتایا کہ جنہیں پرنٹر پبلیشر بنایا تھا انہوں نے کل کہا کہ جتنا بجٹ اخبار کے لئے سوچا تھا، اس سے بھی زیادہ ہو گیا اب میں مزید انتظام نہ کرسکوں گا اور وہ زبردستی ایک مہینہ کے اخبار کے لئے اخراجات کی رقم بھی دے گئے ہیں۔ اسی مہینہ میں پھر ڈکلریشن تبدیل ہوا اور اب عزائم کے پروپرائٹر ایڈیٹر اور پرنٹر پبلیشر کی لائن میں صرف ایک نام رہ گیا وہ تھا جمیل مہدی۔ لیکن ہمارے تعلق میں نہ پہلے فرق آیا تھا نہ اس کے بعد آیا اور عزائم نکلتا رہا، اس واقعہ کو شاید دو تین مہینے ہوئے ہوں گے کہ میرے پاس دو بجے دن میں والد ماجد کا ٹیلی فون آیا انہوں نے بتایا کہ بھائی جمیل کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے تم فوراً ان کے پاس چلے جاؤ۔

میں نے ہلواسیہ جا کر دیکھا تو بیٹھے ہوئے اداریہ لکھ رہے تھے۔ میرے ساتھ چند باتیں ہوئیں، میں نے معلوم کیا کہ کیا پروگرام بنایا، کہنے لگے دہرہ شام کو سات بجے جاتی ہے اس وقت تک رونے سے بہتر یہ ہے کہ دو چار اداریے لکھ دوں باقی تم کر لینا، نہ معلوم کب واپسی ہو یا ہو بھی نہ۔

دو گھنٹے ساتھ رہا اور ان کے ہر جملے سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب شاید واپسی نہ ہو، کبھی کہتے یار گھر ہی ختم ہو گیا، گھر میں صرف ایک جوان بیوہ اور اس کے چھوٹے بچے ہیں، میں نہیں تو کون سنبھالے گا؟ ہر جملہ سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ لکھنؤ سے دور اور دیوبند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں، خدا خدا کر کے ٦ بجے میں نے اسٹیشن تک ساتھ جانے کے لئے کہا کہنے لگے کہاں تک ساتھ دو گے؟ میں نے بس اتنا کہا چلئے گاڑی میں سوار کرا دوں، اور وہ دیوبند چلے گئے۔

دو ہفتہ کے بعد ان کا ایک خط آیا بقول بشیر بدر

ع کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا

اس کی پوری کہانی میں نے اس مضمون میں لکھ دی ہے جو لاری صاحب کی جدائی پر لکھا ہے۔ لاری صاحب نے نہ صرف انہیں بلا لیا بلکہ سنبھال لیا، اچانک معلوم ہوا کہ نرہی کے پاس پرانے گیسٹ ہاؤس سے ملے ہوئے کچھ چھوٹے فلیٹ بنے ہیں جو آفیسرس ہوسٹل ہے، وہ ان افسروں کے لئے ہیں جو کہیں سے تبدیل ہو کر آئیں اور مکان خالی نہ ہو تو عارضی طور پر ہوسٹل میں قیام کریں۔ بہوگناجی نے اس میں سے دس فلیٹ صحافیوں کے لئے مخصوص کر دئے اور ان میں سے ایک اردو صحافی اقبال صدیقی صاحب کو بھی مل گیا، وہ "عہد نو" نکالتے تھے اور بہوگناجی ان کی بہت مدد کرتے تھے، اقبال صاحب کثیر العیال تھے، جمیل بھائی نے ان سے کہا کہ فلیٹ تمہارے لئے تو نا کافی ہے اگر بے ضرورت ہو تو مجھے دے دو نام تمہارا ہی رہے گا، کرایہ میں دے دیا کروں گا۔ اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ ہلواسیہ کورٹ کے کمرے دو چار مہینے میں خالی کرنا تھے۔

اس فلیٹ میں زندگی کا ضروری سامان تھا، پلنگ، کرسی، میز اور ایک

لوہے کی بڑی الماری۔ جمیل بھائی نے ایک دن کہا۔ یار حفیظ ''عزائم'' کو روز نامہ کرا دے۔ میں نے ہنس کر کہا کہ یہ جو الماری رکھی ہے یہ آدھی نوٹوں سے بھری ہوئی دکھا دیجئے، میں روز نامہ نکلوا دوں گا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اس کے کئی مہینے کے بعد ایک دن اچانک پریس آئے، چائے پی، اِدھر اُدھر کی باتیں کیں، پھر کہا پیارے! روز نامہ کا انتظام ہو گیا۔ اچھا! کیسے؟ میرے منھ سے نکل گیا۔ کہنے لگے لاری صاحب کے پاس سے آ رہا ہوں انہوں نے کہا ہے نکالو اور انہوں نے یونس سلیم صاحب سے بھی بات کی ہے اور ان سے کہا ہے کہ جب تک خود کفیل نہ ہو جائے آدھا خرچ میں برداشت کروں گا آدھا آپ انتظام کر دیں اور وہ تیار ہو گئے ہیں۔ مسئلہ جگہ کا آیا تو ہم دونوں ایوان حیدر گئے اور شہیر حیدر جو میرے بہت پرانے اور بہت اچھے دوست تھے، ان سے دو کمرے مانگے انہیں کرایہ مانگتے شرم آئی، کہا اشو میاں (چودھری اشہر حسین) کی چائے سگریٹ کے لئے آپ ڈھائی سو روپے دے دیا کریں۔ اس لئے کہ یہ کمرے ان کے ہیں اور وہ اوپر موجود ہیں۔ غرض کہ ہر مرحلہ طے ہو گیا اور بنام خدا ''عزائم'' روز نامہ ہو گیا وہ عزائم جو ہفت روزہ بھی نکلنا مشکل ہو رہا تھا۔ جمیل بھائی نے کہا کہ حفیظ ایک سال تم مدد کر دو پھر میں ٹیم بنا لونگا۔ میں نے وعدہ کر لیا کہ شام کو پریس بند کرانے کے بعد روز آ جاؤنگا اور دس بجے تک پوری مدد کرونگا۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے پورے ایک سال اخبار سنبھالا اور اس کا ایک معیار بنانے میں مدد کی۔ جس دن اس کی پہلی سالگرہ تھی اس دن سب نے مٹھائی کھائی اور چلتے وقت میں نے کہا میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اب آؤنگا تو صرف تفریح کے لئے۔

یہاں ایک بات کا ذکر کر دینا بہتر ہوگا کہ جمیل بھائی جب دیو بند سے آئے اور قائد میں بحیثیت اڈیٹر انکا نام جمیل مہدی چھپا تو لکھنؤ میں اس شبہ کا اظہار کیا جانے لگا کہ جمیل صاحب کیا شیعہ ہیں؟ اس کی وجہ نام میں مہدی لگا ہونا تھا۔ لکھنؤ کے ایک بہت تیز اور مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے والے صحافی

سلاست علی مہدی سے سب واقف تھے وہ بہت دنوں تک کانپور کے سیاست جدید کے اڈیٹر رہے اور یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں میں سیاست محترم صحیفہ کی طرح پڑھا جاتا تھا۔

میرے دوستوں نے جب میرے ساتھ دیکھا تو مجھ سے معلوم کیا۔ میں نے بتایا کہ ان کے والد کا نام مہدی حسن ہے اسی رشتہ سے وہ مہدی لکھتے ہیں، ان کا مکان دیوبند میں دارالعلوم سے ملا ہوا ہے، ان کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی ہے اور ان کے والد علامہ ابراہیم بلیاوی کی مجلس میں بیٹھنے والوں میں سے ایک تھے، لہذا ان کے شیعہ ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ لکھنؤ کے سنی اس معاملہ میں جتنے حساس ہیں میں شاید اس لئے نہیں ہوں کہ میں سنبھل میں پیدا ہوا۔ ۱۶؍سال کی عمر تک بریلی میں رہا پھر لکھنؤ آیا تب بھی اپنے ماحول میں رہنا ہوا۔ لکھنؤ والے خاموش تو ہو گئے لیکن پھانس نہ نکل سکی۔

روزنامہ "عزائم" کا پہلا سال چل رہا تھا اور میں حسب وعدہ اپنا شام کا وقت پوری ذمہ داری سے دے رہا تھا کہ ایک دن کاتب الیاس صاحب جو اداریہ کی کتابت کرتے تھے، ان کی آواز آئی کہ اداریہ دیدیجئے۔ جمیل بھائی اپنے فلیٹ سے پہلے لاری صاحب کے پاس جاتے تھے پھر دفتر آتے تھے، میں نے کہہ دیا کہ تھوڑا سا انتظار کیجئے اداریہ آتا ہی ہوگا۔ چند منٹ کے بعد جمیل بھائی آئے اور رُکے بغیر کتابت خانہ میں چلے گئے، واپس آئے تو میں نے کہا کہ الیاس کو اداریہ دیدیجئے۔ کہنے لگے انہیں میں نے دوسری چیز دے دی ہے اداریہ حسن اختر لکھ دیں گے۔ بات ختم ہوگئی نہ میں نے معلوم کیا کہ الیاس کو کیا دیا، نہ انہوں نے بتانا ضروری سمجھا۔

صبح اخبار میں ایک وکیل..........صاحب کا مضمون پڑھا تو حیران رہ گیا کہ یہ تو میری موجودگی میں آیا نہیں تھا پھر یہ کب آگیا؟ مضمون میں عیدگاہ کمیٹی پر انتہائی بیہودہ اور بے سرپیر کے الزامات لگائے گئے تھے۔ شام کو میں دفتر پہنچا تو مجھے بتایا گیا کے کئی ٹیلی فون آچکے ہیں، آپ سے یا جمیل بھائی سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرے بیٹھتے ہی وقفہ وقفہ سے پھر ٹیلی فون اسی مضمون سے متعلق

آئے، میں نے بس اتنا جواب دے دیا کہ مضمون واقعی چھپا ہے لیکن میں رات کو دس بجے چلا جاتا ہوں اس کے بعد شاید آیا ہوگا۔ آپ تھوڑی دیر میں بات کریں، جمیل بھائی آتے ہی ہوں گے۔ پھر جمیل بھائی آئے تو اس حال میں کہ چہرہ سے پریشانی صاف عیاں تھی۔ میں نے مضمون کا ذکر کیا کہنے لگے پھر بات کرونگا۔ فون برابر آتے رہے اور وہ صفائی دیتے رہے۔

تین دن اسی حال میں گذر گئے اور بات دبی نہیں بلکہ اس کا حلقہ بڑھتا ہی رہا۔ چوتھے دن دارالعلوم ندوہ کے میدان میں نماز استقاء ہونے والی تھی حضرت مولانا علی میاں کو نماز پڑھانا تھی اور والد ماجد کو دعا کرانا تھی۔ جمیل بھائی صبح ہی صبح ساتھ جانے کے لئے میرے پاس آگئے پھر ہم دونوں ایک رکشہ پر ندوہ کے لئے چل پڑے۔ قیصر باغ کے پاس میں نے معلوم کیا کہ یہ مضمون کیسے چھپا، کب آیا اور مجھے کیوں نہیں بتایا؟ کہنے لگے وہ جو (سالی) کسی کی تحریر نہ پڑھنے کی عادت ہے، اس کی ہی لائی ہوئی یہ مصیبت ہے۔ وکیل صاحب لاری صاحب کے گھر بیٹھے تھے، زوردار تقریر چل رہی تھی، میں بھی سنتا رہا، لاری صاحب نے کہا کہ یہاں تقریر سے کیا فائدہ آپ ان حقائق کو چھپوا دیجئے، انہوں نے کہا کہ کوئی چھاپتا نہیں۔ لاری صاحب بولے یہ جمیل صاحب بیٹھے ہیں انہیں دیجئے یہ کسی سے نہیں ڈرتے، یہ عزائم میں چھاپیں گے۔ انہوں نے لفافہ مجھے دیا، میں نے جیب میں رکھ لیا اور آتے ہی الیاس کو دے دیا۔

لکھنؤ سے اردو کا اخبار صرف قومی آواز نکل رہا تھا، ۱۹۷۷ء میں مرکزی حکومت بدل گئی اور کانگریس باہر ہوگئی تو دو سال کے بعد ہی اخبار ہچکیاں لینے لگا۔ پھر نوبت یہ آگئی کہ کبھی کاغذ نہیں ہے، کبھی سیاہی نہیں ہے، کبھی تنخواہ نہ ملنے کی بنا پر پریس کے ملازموں نے ہڑتال کردی۔ دو تین کاتب وہ تھے جو قومی آواز میں بھی کام کرتے تھے، ان سے معلوم ہو جاتا تھا کہ کل قومی آواز نہیں نکلے گا اس دن ''عزائم'' بہت بڑی تعداد میں چھپتا تھا اور شہر بھر میں وہی نظر آتا تھا، اسے پڑھنے

اور بار بار پڑھنے سے ''عزائم'' کا حلقہ بھی بڑھ گیا اور مستقل خریدار بھی بڑھ گئے،
۱۹۸۰ء کا الیکشن آیا تو یونس سلیم صاحب کو کانگریس کا ٹکٹ نہیں ملا تو وہ دیوراج ارس کی۔ارس کانگریس کے قومی جنرل سکریٹری بن گئے! انہوں نے جمیل بھائی کو دہلی بلایا اور کسی بڑی مدد کی امید دلائی، جمیل بھائی نے مجھ سے کہا کہ میں دہلی جارہا ہوں، میرے پیچھے دس بارہ دن اخبار سنبھال لو۔اور اداریہ کے لئے میں نے حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب سے بات کرلی ہے وہ لکھ دیا کریں گے۔اخبار نکلتا رہا، جمیل بھائی دہلی میں اٹک گئے، حکیم صاحب نے دس اداریوں کے بعد کہہ دیا کہ جمیل صاحب نے دس اداریوں کے لئے کہا تھا وہ میں نے لکھ دئے۔

حکیم صاحب کے انکار کے بعد اداریہ کا مسئلہ تھا، بنام خدا میں نے قلم اٹھایا اور لکھ دیا۔پھر پانچ دن تک میں ہی لکھتا رہا، چھٹے دن وہ آ گئے، مجھے معلوم ہوا تو شام کو ملنے گیا، باتیں ہوئیں حالات پر گفتگو ہوئی اور میں چلا آیا۔دوسرے دن ملاقات ہوئی تو کہنے لگے کہ حکیم صاحب کے اداریے کیوں بند کردئے؟ میں نے بتایا کہ انہوں نے انکار کردیا اور میرا معاملہ تھا نہیں جو میں ان سے بات کرتا، اس لئے میں نے خود لکھ دئے۔ہلکی آواز میں بدبداتے ہوئے کہا کہ پرانے اداریوں میں سے چھانٹ کر چھاپ دئے ہوتے، میں نے جواب دیا کہ اخباری دنیا سے بے خبر کوئی ایسی بات کہتا تو سمجھ میں آجاتی۔یہ آپ کہہ رہے ہیں جو پوری زندگی اخباروں میں گذار کر آئے ہیں اور جانتے ہیں کہ آج کا اخبار دوسرے دن ردّی مانا جاتا ہے!کئی دن کے بعد معلوم ہوا کہ جمیل بھائی سے بعض دوستوں نے میرے اداریوں کی تعریف کردی تھی جو ان کے لئے ناقابل برداشت تھی، اس لئے کہ وہ اپنے علاوہ کسی کی تعریف کرتو دیتے تھے سن نہیں سکتے تھے۔

تین سال پہلے جب ۱۹۷۷ء کا الیکشن ہورہا تھا تو میں کسی لمبے سفر سے واپس آیا تھا، اسی دن شام کو والی آسی سے ملاقات ہوئی، والی بھی حیدرآباد سے لوٹے تھے، میں نے معلوم کیا کہ حیدرآباد میں الیکشن کا کیا حال دیکھا؟ کہنے لگے: باپ رے باپ! اتنا بڑا جلوس زندگی میں نہیں دیکھا تھا، جتنا این ٹی راما راؤ کا

دیکھا۔ صلاح الدین اویسی صاحب حیدرآباد کے مشاعرہ کے دوسرے دن ہمیں نظام آباد لے جا رہے تھے، ہائی وے پر پہنچے تو ہمارے قافلہ کو رکنا پڑا، پورے دو گھنٹے میں جلوس پاس ہوا۔ دوسرے دن میں جمیل بھائی سے ملنے گیا تو وہ اداریہ لکھ رہے تھے، الیکشن کا شور ختم ہو گیا تھا، پولنگ اور نتیجے باقی تھے۔ میں نے معلوم کیا کہ کسے جتا رہے ہیں؟ کہنے لگے کانگریس کو۔ میں نے کہا کہ میں ایک لمبے سفر سے واپس آرہا ہوں ایک آدمی بھی ایسا نہیں ملا جس نے کانگریس کی تعریف کی ہو۔ اور کل والی آ سی حیدرآباد سے آئے ہیں انہوں نے این ٹی راما راؤ کا جلوس دیکھا ہے۔ آپ ہرائیں یا جتائیں مگر ہندسہ نہ لکھئے گا۔ کہنے لگے میں نے تو کانگریس کو ۲۶۵ سیٹیں دے دیں۔ میں نے پھر کہا میری بات مانئے ہندسہ کاٹ دیجئے۔ کہنے لگے پیارے! اب تو میں نے لکھ دیا۔ چند روز کے بعد نتیجے آئے تو کانگریس صاف ہو چکی تھی، میں نے یاد دلایا اور کہا کہ آپ نے میری بات نہیں مانی۔ ان کا مزاج تھا کہ وہ تسلیم نہیں کرتے تھے، تاویلیں کرنے لگتے تھے۔ ان کے پاس ۲۶۵ کے ہندسوں کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ اس میں کانگریسیوں کی غلطیاں گنانے لگے اور یہ کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو ۲۶۵ ہوتے۔

میرے پیش نظر مضمون لکھنا ہے کتاب نہیں اس لئے کہ پندرہ سال کی رفاقت وہ بھی سگے بھائیوں سے زیادہ جذباتی۔ اس لئے بس ان کی تصویر کی جھلکیاں دکھا رہا ہوں۔

اتر پردیش میں اردو کے لئے چلنے والی تحریکوں سے وہ کبھی وابستہ نہیں رہے، صرف حیات اللہ انصاری، قاضی عبدالغفار اور قاضی عدیل عباسی صاحبان کی طرف سے چلائی جانے والی بیس لاکھ دستخطوں کی مہم میں انہوں نے ضرور حصہ لیا تھا، اس کے بعد کچھ نہیں لیکن لکھنؤ میں رہنے کی وجہ سے اردو کی ہر تحریک سے ہمارا تعلق بھی رہا، ہم شریک بھی رہے اور پریس کے ذریعہ ممکن مدد بھی کی۔ اسی وجہ سے جب اردو اکادمی بنی تو سب سے زیادہ قلم کے ذریعہ مخالفت ہم نے کی۔ جس اخبار سے تعلق رکھا اس میں کئی برس کے بعد یہ خبر آئی کہ اردو اکادمی عالمی اردو

کانفرنس کرنے جارہی ہے۔ یہ خبر ہمارے اوپر بجلی بن کر گری، ہم نے مزید تحقیق کی تو پتہ چلا کہ ڈاکٹر ملک زادہ منظور اور افسانہ نگار رام لعل پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کرنے گئے ہیں، اس خبر کے بعد ہم نے ہنگامہ کھڑا کردیا۔

ہمارا کہنا یہ تھا کہ اردو اکادمی اردو پڑھنے، اردو پڑھانے، سہ لسانی فارمولے میں اسے شامل کرنے، اسے دوسری سرکاری یا علاقائی زبان بنانے اور سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں رائج کرنے کے مطالبہ کے جواب میں ملی تھی۔ لیکن اکادمی ملنے کے بعد اردو کو سب بھول گئے اور اپنی اپنی دستار میں مور کا پر لگانے میں لگ گئے، ملک زادہ صاحب اور رام لعل صاحب کی واپسی کے بعد ہم نے اسے اپنا موضوع بنالیا اور طے کرلیا کہ عالمی اردو کانفرنس تو نہ ہونے دیں گے۔ جمیل بھائی تقریباً اس جنگ سے بے تعلق تھے اور ہم اپنا حق سمجھتے ہوئے ''عزائم'' کے ذریعہ یہ جنگ لڑ رہے تھے۔ پھر ہم چند دوست حیات اللہ صاحب سے ملے اور انہیں قیادت پر آمادہ کرلیا، چند روز کے بعد رائل کیفے میں ایک پریس کانفرنس بلائی، اس میں درجنوں نمائندے آگئے، اسی میں ایک گھنٹہ سوال و جواب کے بعد حیات اللہ صاحب نے کہا کہ اگر عالمی اردو کانفرنس ہوئی تو وہ ایک نہیں دو ہوں گی۔ دوسری ہم لوگ کسی بڑے میدان میں اصلی عالمی اردو کانفرنس کریں گے، جس میں ٹاٹ پٹی دکھائی جائے گی جس پر بچے پڑھتے ہیں، ٹوٹا بلیک بورڈ ہوگا، پڑھنے والے وہ ہوں گے جن کے بستے پھٹے ہوئے، کپڑے میلے، پڑھانے والے بھی ایک نمونہ اور جو پڑھایا جارہا ہے اس کا مظاہرہ۔

ہم لوگوں کے یہ تیور دیکھ کر عالمی کانفرنس ملتوی کردی گئی۔ ہم نے صرف ایک بات کہی کہ اس سے اردو کو کچھ نہیں ملے گا، بس اتنا ہوگا کہ اردو اکادمی والے دوسرے ملکوں کے ادیبوں کو بلائیں گے اور دوسرے ملکوں والے ملک زادہ اور رام لعل جیسوں کو بلالیں گے، اردو اکادمی کے نام پر ذاتی کاروبار ہم نہیں ہونے دیں گے۔ بعد میں ایک بحث چھڑ گئی اور جمیل بھائی بھی جاکر اُن کے ساتھ

کھڑے ہوگئے جن کا موقف یہ تھا کہ عالمی اردو کانفرنس ملتوی ہونے سے اردو کا بہت بڑا نقصان ہوا۔

اس مسئلہ میں میرے اور ان کے درمیان اختلاف ہوگیا، میرے نزدیک اختلاف کا سبب اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ ہم نے حیات اللہ انصاری صاحب کو ساتھ لے لیا تھا، جمیل بھائی اور حیات اللہ انصاری صاحب کے درمیان ''قائد'' کے زمانے میں مستقل قلمی جنگ رہتی تھی کہ انصاری صاحب پہلے دن سے مجلس مشاورت کے مخالف تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اس قدر کانگریس پرست تھے کہ ہر اس شخصیت کے مخالف ہوجاتے تھے جو کانگریس پر تنقید کرے۔ ۱۹۶۱ء اور اس کے بعد جو جگہ جگہ مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور مرکز سے لے کر تمام صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں ہونے کے باوجود ہوا، وہ اس قتل عام پر بھی لب کشائی برداشت نہیں کرتے تھے اور ہر ایک کے مقابلہ پر قلم کو تلوار بنالیتے تھے۔ جمیل بھائی کو ہمارے اور حیات اللہ صاحب کے تعلق سے کچھ زیادہ ہی تکلیف ہوئی۔ اور انہوں نے ''عزائم'' میں کئی ایسے مراسلے چھاپ دئے جن میں مجھے نشانہ بنایا گیا تھا۔ میں جمیل بھائی کے پاس گیا اور میں نے صرف یہ معلوم کیا کہ ان مراسلوں میں جو کہا گیا ہے کیا آپ کو اس سے اتفاق ہے؟ کہنے لگے بالکل نہیں۔ تم اس کا جواب لکھو میں تمہارا جواب بھی چھاپونگا۔ میرے لئے آج بھی یہ معمہ ہے کہ وہ کون تھا جس نے جمیل بھائی کو میرے مخالفوں کی صف میں کھڑا کردیا؟

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ لکھنؤ والے جمیل بھائی کو شیعہ سمجھے تھے لیکن کافی دنوں تک ان کے قلم سے ''عزائم'' میں کوئی ایسی بات نہیں چھپی جس سے اس شبہہ کو تقویت ملتی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ کس سال کے کس مہینہ کی بات ہے کہ اپنے کو واجد علی شاہ کا وارث بتانے والے پرنس انجم قدر لکھنؤ آئے۔ ان کے آنے پر ایسا ماحول بنا جیسے بس اب تاجپوشی ہونے ہی والی ہے۔ جگہ جگہ ان کا استقبال، ہار پھول کی برسات، ہر طرف چرچے، معلوم ہوا کہ ان کا قیام کارلٹن ہوٹل میں ہے اور ان کے

دربار میں حاضری دینے والوں کی لائن لگتی ہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ شیعان لکھنؤ کے ایک چھوٹے سے طبقہ میں وہ سمٹ کر رہ گئے اور اکثریت ان سے کٹ گئی۔

اسی زمانہ میں پرنس کا ایک مضمون ''عزائم'' میں چھپا، جس میں لکھنؤ کے سینوں کو کچھ نظر آیا مگر بات دب گئی۔ اس کے بعد ان کے اور بھی مضمون چھپے، ان میں بھی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن ایک مضمون چھپا تو اس میں انہوں نے لکھا کہ شیعوں نے اذان میں اضافہ کیا اور خلیفہ بلا فصل جیسے کلمات جوڑے لیکن سنی یہ نہیں دیکھتے کہ حضرت عمرؓ نے بھی "الصلاۃ خیر من النوم" کا اضافہ کیا تھا، (اہل علم جانتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اضافہ نہیں کیا تھا بلکہ ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو سوتا ہوا سمجھ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں کہا تھا کہ الصلوۃ خیر من النوم جس کے جواب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اس کلمہ کو اذان تک ہی رہنے دو۔) اس کا چھپنا تھا کہ بھونچال آ گیا، لوگوں نے جمیل بھائی کو گھیرا تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ تو بطور اشتہار چھپا ہے، ہم نے اس کے کمرشیل ریٹ سے پیسے لئے ہیں۔ پھر ایسے بھی کئی لوگ ملے جنہوں نے بتایا کہ جمیل بھائی کو کارٹن ہوٹل میں پرنس انجم قدر کے کمرہ میں انہوں نے جاتے دیکھا ہے۔ پھر یہ مشہور ہو گیا کہ پرنس ''عزائم'' کی مالی مدد کر رہے ہیں۔

جمیل بھائی نے صفائی ضروری سمجھتے ہوئے اپنے اداریوں میں بہت کچھ لکھا۔ بعد میں ایک موقعہ پر خلافت راشدہ کی تاریخ دہراتے ہوئے لکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنی حیات میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ بنا دیا تھا لیکن حضرت عمرؓ نے جمہوری طریقہ اختیار فرمایا اور اکابر صحابہؓ سے فرمایا کہ تم لوگ سقیفۂ بنو سقیفہ میں جمع ہو کر امیر کا انتخاب کر لو اور یہ بھی فرمایا کہ جن ناموں پر غور کرو ان میں میرا بیٹا نہ ہو۔ خدا جانے کیسے سقیفۂ بنو سقیفہ ان کے قلم سے کئی بار نکلا۔ مولانا عبدالعلی فاروقی نے اپنے رسالہ ''البدر'' میں جمیل بھائی کے مضامین پر اور پرنس نوازی پر زبردست تنقید کی اور یہ بھی لکھ دیا کہ اپنے کو عقلِ کل سمجھنے والے جمیل صاحب نے سقیفۂ بنو ساعدہ کو سقیفۂ بنو سقیفہ لکھا ہے جس کا مطلب بنو چوپال کی چوپال

ہوتا ہے۔ اس پھبتی کو لکھنؤ والے لے اڑے اور انہیں لکھنا پڑا کہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر آدمی عربی جانتا ہو۔

پرنس انجم قدر نے آکر دوبارہ جمیل بھائی کے عقیدہ کا مسئلہ کھڑا کر دیا، یاد آتا ہے کہ انجم قدر کے لکھنؤ سے مایوس ہو کر واپس جانے کے بعد مولانا کلب عابد صاحب کا ایک کار کے حادثہ میں انتقال ہو گیا۔ مولانا اپنے نرم رویہ اور مجالس میں متنازعہ مضامین سے پرہیز کرنے کی وجہ سے سنیوں کے بھی محترم تھے۔ جس کا مظاہرہ سب سے زیادہ اس وقت ہوا جب ان کی نماز جنازہ آصفی مسجد میں ہونے کے بعد اہل سنت کا ایک گروہ جنازہ کو ٹیلے والی مسجد کے میدان میں لے گیا اور دوسری نماز اپنے عقیدے کے مطابق پڑھ کر جنازہ کو غفرانمآب لانے میں ساتھ دیا۔ جمیل بھائی نے مولانا کے انتقال پر تعزیتی اداریہ لکھا جس میں ایک جملہ یہ تھا کہ خدا کرے مولانا کا انجام ان کے نانا کے ساتھ ہو۔

''عزائم'' اور جمیل بھائی کا تذکرہ مختلف مجالس میں مختلف انداز سے ہوا کرتا تھا اور ان کے اس حلقہ پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا جو ان کا اپنا بنایا ہوا تھا، میں لکھ چکا ہوں کہ ''عزائم'' کے دفتر یا جمیل بھائی کے کمرہ پر میں نے جانا بند کر دیا تھا، سرِ راہ ملاقات ہوتی تو مسکراہٹ کے ساتھ سلام پھر ایک لمحہ کے وقفہ کے بعد عیسیٰ اپنی راہ اور موسیٰ اپنی راہ۔ اس زمانہ سے سال ڈیڑھ سال پہلے دار العلوم دیوبند میں ایک بہت بڑا حادثہ پیش آ گیا تھا۔ ہوا یہ کہ دار العلوم کا روپیہ بینک میں نہیں رہتا تھا، وہ ایک بہت محفوظ کمرہ میں رہتا تھا جسے خزانہ کہا جاتا تھا۔ ایک دن اچانک معلوم ہوا کہ اس میں ایک لاکھ روپے کم ہیں۔ اس کی چابیاں حضرت مولانا قاری طیب صاحب مہتمم کے پاس رہتی تھیں اور ان کے معتمد ہی روپیہ رکھتے اور نکالتے تھے۔ مجلس شوریٰ کا اجلاس ہوا تو اس مسئلہ کا بھی ذکر آیا، اس جلسہ میں فیصلہ کیا گیا کہ اب روپیہ بینک میں رکھوایا جائے۔ بینک میں اکاؤنٹ کھلوانے کے لئے کسی کو بھیجا گیا تو جواب ملا کہ کسی فرد یا دکان کا اکاؤنٹ تو کھل سکتا ہے لیکن دار العلوم جیسے

ادارہ کا صرف مجلس شوریٰ کی تجویز پر نہیں کھل سکتا، اس کے لئے رجسٹرڈ سوسائیٹی ضروری ہے۔ اسی مجلس میں یہ فیصلہ ہوگیا کہ مجلس شوری کے چند ممبروں کی ایک سوسائیٹی بنا کر اسے رجسٹرڈ کرالیا جائے۔ یہ کام بھی کچھ دنوں میں ہوگیا۔

مجلس شوریٰ کے کسی دوسرے جلسہ میں حضرت مولانا قاری طیب صاحب نے ایک خط لکھا کہ میں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ اتنے بڑے ادارہ کی ہر چیز پر نظر نہیں رکھ سکتا اس لئے مہتمم تو مجھے رہنے دیا جائے لیکن مجھے مسئول (جوابدہ) نہ رکھا جائے۔ اس کے لئے میرے بڑے بیٹے مولانا سالم قاسمی کو نائب اور کارگذار مہتمم بنا دیا جائے۔ مجلس شوریٰ کے تمام محترم ارکان نے اسے تو منظور کرلیا کہ حضرت مہتمم صاحب برقرار رہیں اور جوابدہ نہ ہوں لیکن اسے نہیں مانا کہ مولانا سالم صاحب کو کارگذار نائب مہتمم بنا دیا جائے۔ اس کے لئے مجلس شوریٰ نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ طے کرے گی کہ کارگذار مہتمم کون ہو۔ دن بھر باہمی مشوروں کے بعد اس پر سب کا اتفاق ہوگیا کہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب کو آمادہ کیا جائے کہ وہ یہ ذمہ داری قبول فرمالیں۔ مولانا مرغوب صاحب بہت بڑے زمیندار، بہت سے باغات کے مالک اور بہت دولت مند عالم دین تھے وہ ہزاروں روپے سے دارالعلوم کی مدد کرتے رہتے تھے۔ انہیں اس میں تردد تھا کہ وہ ایسی ذمہ داری قبول کریں جس میں ہر چھ ماہ کے بعد ہر بات کا جواب دینا پڑے۔ لیکن جب سب نے ان سے درخواست کی تو وہ بمشکل آمادہ ہوگئے اور اس فیصلہ سے ناراض ہو کر حضرت مولانا طیب صاحب مجلس کے مقابلہ پر آگئے اور دارالعلوم کچھ دن کے لئے بند کردیا گیا۔ یہ کہانی اتنی طویل ہے کہ اس پر پوری بات لکھنا ناممکن ہے۔ میں بس جمیل بھائی کے کردار کا تذکرہ کروں گا۔

مولانا سالم صاحب کی جمیل بھائی سے دوستی تھی اور یہ تعلق بھی تھا کہ دونوں ایک شہر کے نہیں ایک محلّہ کے رہنے والے اور بچپن کے دوست تھے۔ مولانا اسعد میاں دیوبند کے نہیں تھے۔ اور کچھ سیاسی اختلاف بھی تھا جس کی وجہ سے وہ

اسعد میاں کے ہمیشہ مخالف رہے۔ حضرت مہتمم صاحب اسے اپنے خاندان کی میراث مانتے تھے، مجلس شوریٰ اسے مسلمانوں کا ادارہ کہتی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ صف بندی ہوگئی اور قلمی جنگ شروع ہوگئی، جمیل بھائی نے ''عزائم'' کو مولانا سالم صاحب کی حمایت میں تلوار بنالیا اور اس حد پر آگئے کہ کسی دوسرے کی بات سننے پر بھی آمادہ نہیں ہوئے۔ مجلس شوریٰ کے اس زمانہ میں سب سے سینئر ممبر والد ماجد تھے۔ جمیل بھائی لکھنؤ کے قیام (جو برسوں سے تھا) کے زمانہ میں برابر حاضری دیتے اور مسائل پر گفتگو کیا کرتے تھے، والد ماجد نے انہیں بلایا تو پہلو تہی کر گئے۔ میں نے ایک دن جا کر والد ماجد کے دئے ہوئے دو طویل چھپے ہوئے مضمون دئے کہ اخبار آپ کا ہے آپ جو چاہیں لکھیں مگر صحافت میں دیانت جس کے آپ علم بردار رہے ہیں یہ تو نہیں ہے کہ دوسرے کی بات ہی نہ سنو اور ایک طرف کی کہے جاؤ۔ انہوں نے مضمون رکھ لئے اور اس موضوع پر بات کرنے کے بجائے دوسرا موضوع چھیڑ دیا۔ میں نے پھر بات کرنا چاہی تو کہنے لگے کہ دیوبند میرا گھر ہے اور ان معاملات کو جتنا میں جانتا ہوں کوئی نہیں جانتا۔ اور سنو یہ سب اسعد میاں کا کھیل ہے۔ اس جملہ کے بعد میں اٹھنے لگا تو نہ انہوں نے روکا نہ میں رکا۔ مجھے ان کی وہ بات یاد تھی جو انہوں نے عیدگاہ کمیٹی والے مضمون کی اشاعت اور اس پر ہونے والے ہنگامہ پر کہی تھی کہ وہ جو (سالی) کسی کی تحریر نہ پڑھنے کی عادت ہے یہ اسی کا لایا ہوا دبال ہے۔

جمیل بھائی جو برسوں میری رگِ جاں کی طرح رہے، میرے ہر مسئلہ میں برابر کے شریک رہے، اس واقعہ کے بعد ایک اجنبی شخصیت بن گئے انہوں نے جس طرح اپنے بقول کے کالر لوٹ لیا اور آنکھوں کا رنگ بدل لیا ہے میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا لیکن جو کچھ تھا وہ سامنے تھا۔ اس کے بعد اس کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی کہ میں کسی مجلس میں ان کا تذکرہ بھی کروں لیکن میں ان سب کی زبان کیسے بند کرسکتا تھا، جنہوں نے ہم دونوں کو برسوں نہیں برسہا برس ساتھ

دیکھا تھا۔ انہی میں سے کسی سے سن لیا کہ پرنس انجم قدر نے آکران کے سوچنے کا انداز بدلا تھا اور حسام الاسلام صدیقی نے انہیں سرکاری اشتہار حاصل کرنے کا گر بتایا اور پھران کے قلم کو نرم کرا کے اشتہاروں کا ڈھیر لگادیا اور ''عزائم'' جو کبھی ایک ایک روپے کے لئے دوسروں کا منھ دیکھا کرتا تھا اور اس کے مالک جمیل مہدی جو برسوں اپنے کو بے مکان اور بے جہان کہتے نہ تھکتے تھے آج ایک دولت مند اخبار بن گیا ہے اور اس کے مالک اندر سے ایک منجھے ہوئے کاروباری ثابت ہوئے ہیں۔

پھراس کی تصدیق بھی ہوگئی اور اس طرح تشہیر ہوئی کہ جب ان کے انتقال کے بعدان کے عزیزان کا سامان لینے اور حسام الاسلام صدیقی سے اخبار کا حساب سمجھنے کے لئے آئے تو لوہے کی الماری میں ایک لاکھ روپے بھی رکھے ملے۔ جس کا نہ کسی کو علم تھا نہ گمان اور اس کی شہرت اس لئے ہوگئی کہ جمیل بھائی کے نئے دوست یا مصاحب ہمدردی میں وہاں موجود تھے۔ یہ سب علم میں آنے کے بعد سمجھ میں آگیا کہ وہ ہر ایک سے بے نیاز کیوں ہوگئے تھے اور کیوں بھول گئے تھے کہ دیوبند سے لکھنؤ لانے والے مولانا محمد منظور نعمانی تھے، لکھنؤ میں روک کران کی جڑیں جمانے والا حفیظ تھا اور مٹھی بند کر کے اور کھول کر مالی مدد کرنے والے لاری صاحب تھے۔

جمیل بھائی کی اندھی حمایت بے غرض نہیں تھی۔ مولانا سالم صاحب کے ہاتھ میں دارالعلوم آجاتا تو وہ اس میں ایک اہم کردار ادا کرتے اور حقیقی دارالعلوم پر فتنوں کی یلغار بند نہ ہونے دیتے، اسی لئے انہوں نے اس موضوع پر لکھا نہیں بلکہ اندھے کی طرح بس لاٹھی گھماتے رہے۔ بہرحال انہوں نے کسی کی کوئی اچھی سے اچھی تحریر بھی پڑھ کر نہیں دی اور اپنی ہی کہتے رہے۔ اس زمانہ میں اللہ انہیں معاف کرے اپنے قلم سے علماء کرام اور بزرگان دین پر ایسی گندی چھینٹیں پھینکیں جتنی تقسیم کے وقت مسلم لیگ کے بے دین اخباروں نے پھینکی

ہوں گی۔ ان مضامین میں سب سے تکلیف کی بات یہ تھی کہ سب کچھ بے حقیقت بلکہ بہتان، افتراء اور جھوٹ کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

جمیل بھائی اپنی سی کہتے رہے مگر پروردگار نے دارالعلوم کو ایسے لوگوں سے بچالیا جو شاید اس کی سو سالہ آبرو کے سوداگر بن جاتے۔ بہرحال مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب نے دارالعلوم کو سنبھال لیا۔

دارالعلوم کے واقعہ کے بعد میرا ان کا کبھی سامنا بھی نہیں ہوا۔ ایک دن عمر انصاری صاحب تشریف لائے، فرمانے لگے جمیل صاحب سے کب سے نہیں ملے ہو؟ میں نے بتایا کہ ایک زمانہ ہوگیا۔ کہنے لگے میں ان کے پاس سے ہی آرہا ہوں، کھانستے تو پہلے بھی رہتے تھے لیکن اب کھانسی میں مسلسل خون آرہا ہے۔ میں نے معلوم کیا کہ حفیظ کو خبر ہے؟ کہنے لگے ہوگی مگر وہ آئے نہیں اور میں ملنا تو چاہتا ہوں مگر کس منہ سے ملوں؟ اتنا کہا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میری رائے ہے تم میرے ساتھ چلو اور مل کر دل صاف کرلو۔ میں نے بتایا کہ عمر صاحب میرا کوئی ذاتی معاملہ نہیں ہے، نہ پیسوں کا تنازعہ ہے۔ انہوں نے جو اپنا اصلی روپ دکھایا، میں نے اسے بھی بھلا دیا لیکن بزرگان دین اور علماء کرام کے سایہ میں پرورش پانے والا اگر سب کچھ جانتے ہوئے بھی جھوٹے الزام لگائے، ان پر کیچڑ اچھالے، شیخ الحدیث کے درسِ حدیث کو فحش کلامی لکھے، تمام حضرات مجلس شوریٰ کو بددیانت اور بے ایمان ثابت کرنے میں زمین آسمان ایک کردے اور سب کچھ جانتے ہوئے ایک کے بعد ایک جھوٹ کا اخبار کو نقیب بنالے تو اس لئے بھی تکلیف ہوگی کہ "عزائم" کے آج وہ مالک ضرور ہیں لیکن حفیظ نعمانی اتنا جی جان سے ساتھ نہ دیتا تو دیوبند میں ہوتے یا دیوبند سے باہر کہیں بھی ہوتے لکھنؤ میں ہرگز نہ ہوتے۔

عمر صاحب نے فرمایا، دیکھو بڑائی اس میں ہے کہ تم چل کر خود مل لو اور جو ہوگیا اس پر خاک ڈالو اس لئے کہ وہ جس کے لئے لڑ رہے تھے انہیں وہ نہیں ملا اور مجلس شوریٰ جو چاہتی تھی وہی ہوا۔ دوسرے دن عمر صاحب کے ساتھ میں ملنے چلا

گیا، دیکھا، سلام کا جواب دیا، کھانسی آئی تو خون بھی تھوکا اور کم از کم تین منٹ خاموشی کے بعد عمر صاحب نے فرمایا دیکھئے میں حفیظ کو لے آیا ہوں، کہا کہنے کو میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ پھر مجھ سے معلوم کرنے لگے سنا ہے تمہاری ٹانگوں میں تکلیف ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بتایا کہ آج کسی وقت بلرام پور اسپتال چلا جاؤں گا ،طبیعت باتیں کرنے کے قابل ہوئجائے تو بہت باتیں کرنا ہیں۔ چند رسمی باتوں کے بعد میں یہ کہہ کر آنے لگا کہ بلرام پور آؤنگا۔ ایک بار بلرام پور میں جا کر ملا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے ڈاکٹر دہلی لے جانے کا مشورہ دے رہے ہیں، اس وقت وہ حسام الاسلام صدیقی سے مالیات اور اخراجات پر گفتگو کر رہے تھے۔ چک بک ہاتھ میں تھی اور ایسے چکوں پر دستخط کر رہے تھے جس پر صرف نام لکھے تھے۔ یہ وہی جمیل بھائی تھے، جنھوں نے ایک دفعہ لاری صاحب سے کہا تھا کہ میں معاملات اور مالیات پر گفتگو نہیں کر پاتا، کل ایک بات کرنے والے کو لاؤں گا، وہ آپ سے پوری بات کریگا اور دوسرے دن وہ مجھے لاری صاحب کے پاس لے گئے تھے۔ لیکن آج وہی جمیل بھائی معاملات اور مالیات پر ایک ماہر ہدایت کار کی طرح گفتگو ہی نہیں ہدایات بھی دے رہے تھے، اخبار سے متعلق بھی، سفر سے متعلق بھی اور علاج کے لئے بھی۔ اُس وقت بزرگوں کی کہی بات یاد آ گئی کہ ”پیسہ پڑھا بھی دیتا ہے اور سب کچھ سکھا بھی دیتا ہے“ اس لئے اسے ستار العیوب و قاضی الحاجات کہا جاتا ہے۔ میں نے واپس آنا چاہا اور یہ کہہ کر اٹھا کہ رات کو اسٹیشن پر ملاقات ہوگی، کہنے لگے اسٹیشن ہرگز نہ آنا سردی بھی ہے اور چلنا بھی پڑتا ہے۔ میں واپس آجاؤں تو اسی کمرہ میں لٹا کر تمہارا علاج کراؤں گا، لیکن میں گیا۔ اور رات کو وہ دہلی کے لئے روانہ ہو گئے، پھر وہ وہاں چلے گئے جہاں سے کوئی نہیں آتا۔ درمیان میں کوئی خبر آئی ہوگی تو شاید لاری صاحب کے پاس آئی ہوگی جس کا کسی نے ذکر نہیں کیا۔

[دیوبند سے آنے والوں میں سے کسی نے بتایا کہ جب جنازہ گھر سے نکلا تو معمول کے مطابق کاندھا دینے والے دار العلوم کے پھاٹک کی طرف

مڑے وہاں مولانا سالم صاحب والے دارالعلوم (وقف) کے بعض ذمہ دار کھڑے تھے انہوں نے اندر جانے سے روک دیا اور دارالعلوم (وقف) لے گئے۔ جمیل بھائی نے جن کے لئے اتنا کچھ کیا، اتنا......شاید ملک میں کسی نے نہیں کیا، انہی لوگوں نے جمیل بھائی کے جنازہ کو نماز کے لئے وہاں نہ رکھنے دیا جہاں قطب، اولیاء اللہ، شیوخ التفسیر اور شیوخ الحدیث کے علاوہ نہ جانے کتنے اللہ کے مقبول بندوں کی نماز پڑھی گئی ہوگی۔

کسی زمانہ میں وہ بمبئی سے نکلنے والے جمعیۃ علماء کے اخبار جمہوریت میں رہے تھے انہوں نے عبدالوحید صدیقی کے اخبار نئی دنیا میں بھی کچھ دن کام کیا اور دیوبند سے اپنا ہفت روزہ "مرکز" بھی نکالا لیکن وہ جس کی تلاش میں تھے وہ انہیں لکھنؤ میں ملا اور اسی لئے انہوں نے دیوبند کو چھوڑ کر لکھنؤ کو اپنا لیا، لیکن اللہ نے ان کے لئے دیوبند کی مٹی ہی لکھی تھی اسی لئے شاید انہوں نے آخری سانس دہلی میں لی۔ اگر یہ حادثہ لکھنؤ میں ہوا ہوتا تو ہوسکتا ہے کہ دیوبند لے جانے کا فیصلہ نہ ہوتا اور ہوتا تو سب کے لئے انتہائی زحمت کا سبب ہوتا۔ پروردگار ان کی مغفرت فرمائے انہوں نے محبت بھی مجھ سے ٹوٹ کر کی اور دوری ہوئی تو ہاتھ کے اس میل کو چھپانے کے لئے جو نہ ان کو صحت دلانے میں کام آیا اور نہ ان کے ساتھ قبر میں جاسکا۔ اور وہ ان کے حصہ میں آیا جنہوں نے نہ کبھی ان کی مدد کی نہ "عزائم" میں ایک روپیہ لگایا۔ خدا عمر انصاری صاحب کو بھی اس کا اجر دے کہ انہوں نے ہم دونوں کو آمنے سامنے بٹھا دیا۔

❁❁❁